مہاتما گاندھی

ہندستان کی قومی زبان

[ہندستان کی قومی زبان کے مسئلے پر آزادی سے بہت پہلے بحث و تمحیص کا سلسلہ شروع ھوگیا تھا جس میں ھمارے تمام قومی رہ نما مسلسل حصّہ لیتے رہے۔ وقت کے ساتھ یہ مباحثہ مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا۔ آزادی کے بعد ھمارے آئین سازوں نے قومی زبانوں کی ایک فہرست دستورِ ھند کے آٹھویں جدول میں مرتّب کی اور اب اس فہرست میں ۱۸ زبانیں درج ھیں جن میں بلا شبہ اردو بھی شامل ھے۔ اس امر کی تکرارِ مسلسل ضروری معلوم ھوتی ھے کہ گاندھی جی کے خیال میں اردو اور دیوناگری دونوں رسمِ خط میں ھندستانی کو آزاد بھارت کی قومی زبان ھونا چاھیے تھا۔ گاندھی جی اس موضوع پر مسلسل سوچتے اور لکھتے رھتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس نے اس موضوع پر جو اھم ترین دستاویز شائع کی تھی ۱۹٤۱ ء میں، قومی اردو کونسل اس کا اردو ترجمہ پہلی مرتبہ جلد ھی کتابی شکل میں شائع کرے گی اور اس کتاب میں شامل ھمارے قومی رہ نماؤں کے تاریخی اھمیت کے مضامین ھر ماہ "اردو دنیا" میں شائع کیے جائیں گے۔ اس کتاب کا ترجمہ ھمارے لیے جناب معین اعجاز نے کیا ھے اور اس ماہ گاندھی جی کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے قومی زبان کے موضوع پر بابائے قوم کا مضمون شائع کیا جا رھا ھے۔ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان]

ہمارے زمانے کی ہندستانی تہذیب تکمیل کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ان تمام تہذیبوں کا ایک آمیزہ بنانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں جو آج ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتی ہیں۔ وہ تہذیب جو اپنے آپ کو سب سے الگ رکھنے کی کوشش کرتی ہے اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہندستان میں آج خالص آریائی تہذیب نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ آریائی، ہندستان کے اصل باشندے تھے یا ناپسندیدہ درانداز، مجھے دلچسپی اس حقیقت سے ہے کہ ہمارے اجداد کا میل جول ایک دوسرے سے انتہائی آزادانہ طور پر ہوا اور ہم موجودہ نسل کے لوگ اسی آمیزش کے مرہونِ منّت ہیں۔ اس سوال کا جواب تو مستقبل ہی دے گا کہ ہم اپنی جنم بھومی

اور اس چھوٹے سے کرۂ ارض کے بھلے کے لیے کچھ کر رہے ہیں جس نے ہمیں سنبھال رکھا ہے یا کہ ہم محض ایک بوجھ ہیں۔

ہندستانی:

میں شروع سے ہی اپنی بات شروع کروں گا۔ گذشتہ کئی برسوں سے کانگریس اس بات کی وکالت کرتی رہی ہے کہ سیاسی ولولوں کے شانہ بشانہ ایک مشترکہ زبان بھی ضروری ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس بات نے ایک ایسا رخ اختیار کیا کہ جا و بے جا قسم کے مباحث میں عوامی مقرّرین ملوّث ہوگئے۔ لیکن یہ بات میرے علم میں ہے کہ اردو کے ادبی حلقوں میں اس نے سادگی اور اپنائیت کا ایک معیار قائم کیا ہے جو اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آیا تھا۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی جیسے عالم نے بھی، جنھوں نے اپنی پوری زندگی عربی کتابوں کے مطالعے میں صرف کی ہے اور ان کا سابقہ ایسے مضامین و موضوعات سے متعلّق لفظیات سے رہا ہے جن میں لغزش کے بغیر ترمیم کی گنجائش پیدا ہی نہیں ہو سکتی، اپنی زبان کو آسان اور ہندی عناصر کا آئینہ دار بنانے کی دلی خواہش کا اظہار کیا ہے کیوں کہ مشترکہ ہندستانی زبان کا تصوّر انھیں بے حد عزیز تھا۔

اس مشترکہ زبان کو کانگیس کے حلقوں نے ’’ہندستانی‘‘ کا نام دیا ہے۔ اگرچہ اس نام کے سوال پر کانگریس اردو اور ہندی کے حامیوں کے ساتھ قطعی مفاہمت کی منزل تک نہیں پہنچ سکی ہے لیکن جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ اپنی وابستگیوں کی وجہ سے نام، سیاسی اور سماجی اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، لہٰذا ہماری مشترکہ قومی زبان کو جو نام دیا جانا ہے وہ اس زاویے سے بہت اہم کام ہے۔ ابھی تک اردو واحد زبان رہی ہے جو کسی صوبے یا فرقے تک محدود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں یہ پورے ہندستان میں بولی جاتی ہے اور شمالی ہند میں اردو بولنے والے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اگر ہماری مشترکہ زبان اردو نہیں کہلا سکتی تو کم از کم ایک ایسا نام تو اس کا ہونا ہی چاہیے جس سے اندازہ ہو کہ اس زبان کو وضع کرنے میں مسلمانوں کا بھی خاص حصّہ ہے اور یہ کم و بیش مشترکہ عناصر کی حامل ہے۔ لفظ ’’ہندستانی‘‘ یہ شرط پوری کر سکتا ہے ’’ہندی‘‘ نہیں۔ ماضی میں مسلمانوں نے اسے پڑھا اور اسے ادبی زبان کا درجہ دلانے میں ان کی خدمات اگر اپنے ہندو بھائیوں سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہیں۔ لیکن چوں کہ اس سے کچھ مذہبی اور تہذیبی وابستگیاں بھی ہیں اس لیے مسلمان مجموعی طور پر اسے اپنی

شناخت نہیں بنا سکتے۔ اس کے علاوہ اب جو یہ اپنا ذخیرۂ الفاظ وضع کر رہی ہے وہ خصوصی طور پر اس کا اپنا ہے اور عام طور پر ان لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا جو صرف اردو جانتے ہیں۔ اس نقطے پر زور دینا یہاں ضروری نہ ہوتا اگر ہندی اور ہندستانی کے درمیان الجھاؤ پیدا کرنے کا رجحان پروان نہ چڑھتا۔ اردو اور ہندستانی کے درمیان کوئی الجھاؤ نہیں ہوا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ تکنیکی اصطلاحات کے اعتبار سے عربی اور سنسکرت دونوں طاقت ور زبانیں ہیں لیکن ایک مشترکہ ہندستانی زبان کا انحصار خصوصی طور پر ان میں سے کسی ایک پر نہیں ہو سکتا کیوں کہ عربی اگر ایک غیر ملکی زبان ہے تو سنسکرت بھی عام طور پر کبھی نہیں بولی گئی اور کوئی بھی شخص اگر عام بول چال کی ہندی سیکھنا چاہے تو اسے اندازہ ہوگا کہ اس میں سنسکرت کے جو الفاظ ہیں ان میں وقت کے ساتھ ساتھ کافی تبدیلیاں رونما ہوچکی ہیں کیوں کہ ان کا تلفّظ نہ صرف یہ کہ مسلمان آسانی سے ادا نہیں کر سکتے بلکہ ہندستان کے عام آدمیوں کو بھی دشواری پیش آئے گی۔ یہاں تک کہ بعض چھوٹے موٹے الفاظ مثلاً ''گرام'' اور ''ورش'' بھی ''گاؤں'' اور ''برس'' بن گئے ہیں۔ ہندی کے بہت سے حامی ان حقائق کو نظرانداز کر دیتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اس طرح کے بہت سارے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے اصل الفاظ داخل کر دیے ہیں۔ اب اسے علمیت بگھارنا کہا جائے، لاعلمی سے تعبیر کیا جائے یا تعصّب کا نام دیا جائے، کیوں کہ جہاں تک اردو کا سوال ہے اس نے سنسکرت کے بول چال کے تمام تر الفاظ کو اپنا لیا ہے۔ یہ بات خیر میرے کہنے کی نہیں ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہندی کے ان دوستوں کو زندہ بول چال کی زبان کے فروغ سے براہِ راست کوئی تعلّق یا دلچسپی نہیں ہے۔ انھیں زیادہ دلچسپی ہندستانی معاشرت پر آریائی رنگ چڑھانے سے ہے۔ اگر ہندو بھائی اصلاح یا ردّ عمل کے لیے اپنے درمیان کام کریں تو یہ مسلمانوں کے لیے کسی طرح کی تشویش کا باعث نہیں بنے گا لیکن مشترکہ ایمانداری کا تقاضہ ہے کہ اس طرح کی تحریکوں کو سختی سے لسانی مسائل سے دور رکھا جائے۔

عادل صاحب کے ایک خط کے جواب میں کے۔ ایم۔ منشی کہتے ہیں کہ گجراتیوں، مراٹھیوں، بنگالیوں اور کیرالا والوں نے ایسی تحریری روایات کو فروغ دیا ہے جن میں خالص اردو عناصر تقریباً ناپید ہیں۔ ''اگر ایسی طور پر ہم ہندی کو فروغ دیں تو ہمیں سنسکرت آمیز ہندی کا سہارا لینا پڑے گا۔'' پہلی بات تو میں یہاں پورے یقین کے ساتھ کہتا

ہوں کہ گجراتی، مراٹھی اور بنگالی میں فارسی کے الفاظ کی تعداد قابلِ ذکر ہے اور میں یہ ماننے کو تیّار نہیں کہ گجرات اور بنگال کے ہندوؤں کو ایک دوسرے کے اور مسلمانوں کے قریب آنے کے لیے اپنی زبان کو لازمی طور پر سنسکرت آمیز بنانے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں خالص اردو عناصر سے کوئی سروکار نہیں بلکہ ہم شمالی ہند کی رائج اور زندہ زبان اور محاوروں کی بات کر رہے ہیں۔ اگر اس زندہ زبان کو ہم مشترکہ زبان کی اساس بناتے ہیں تو مسلمان اس میں بھر پور تعاون کریں گے۔ اس کے بجائے اگر سنسکرت کی جانب مراجعت کی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے ہندی، بنگالی اور گجراتی زبانوں کی ماضی میں جو خدمت کی ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ اگر اس طرح کی کوشش میں ہم سے تعاون مانگا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم سے خود اپنی خودکشی کی تدبیر کرنے کو کہا جا رہا ہے۔

میں ذیل میں ایسے کچھ نکات کی نشاندہی کر رہا ہوں جو میری ناچیز رائے میں خاصی معقولیت پسندی پر مبنی ہیں اور قومی زبان کے فروغ کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ وہ نکات یہ ہیں:

۱۔ ہماری مشترکہ زبان ''ہندستانی'' کہلائے گی نہ کہ ''ہندی۔''

۲۔ ہندستانی کو کسی بھی فرقے کی مذہبی روایات سے وابستہ تصوّر نہیں کیا جائے گا۔

۳۔ کسی بھی لفظ کے لیے ''غیر ملکی'' یا ''دیسی'' جیسی اصطلاح استعمال نہیں کی جائے گی بلکہ ہر لفظ کو مروّجہ تصوّر کیا جائے گا۔

٤۔ ان تمام الفاظ کو جو اردو کے ہندو ادیب اور ہندی کے مسلمان ادیب استعمال کرتے ہیں مروّج تصوّر کیا جائے گا لیکن اس کا اطلاق اردو اور ہندی زبانوں کی مخصوص شکلوں پر نہیں ہوگا۔

٥۔ تکنیکی اصطلاحوں، خاص طور سے سیاسی اصطلاحات کا انتخاب کرتے وقت نئی سنسکرت اصطلاحوں کو ترجیح نہیں دی جانی چاہیے بلکہ ممکنہ حد تک اس بات کی کوشش کی جانی چاہیے کے اردو ہندی اور سنسکرت کی قدرتی اور رائج اصطلاحات کو بروئے کار لایا جائے۔

٦۔ دیوناگری اور عربی دونوں رسم الخط کو مروّج اور سرکاری تصوّر کیا جانا چاہیے نیز یہ کہ ان تمام اداروں میں جن کی پالیسی ہندستانی کو فروغ دینے والے سرکاری

حلقے طے کریں گے، دونوں رسم الخط سیکھنے کی سہولیات مہیّا کی جانی چاہئیں۔

ہندی۔اردو تنازعہ

یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ ہندی اور اردو کے سوال پر ایک تلخ قسم کا تنازعہ پیدا ہو گیا ہے اور اب بھی برقرار ہے۔ جہاں تک کانگریس کا تعلّق ہے، ہندستانی اس کی تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے جسے کل ہند زبان کے طور پر بین صوبائی رابطوں کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ صوبائی زبانوں کو نکال باہر نہیں کرے گی بلکہ ان کی معاونت کرے گی۔ ورکنگ کمیٹی کی حالیہ قرارداد سے تمام شبہات دور ہو جانے چاہئیں۔ اگر کانگریس کے وہ رکن جو کل ہند پیمانے پر کام کر رہے ہیں، دونوں رسم الخط میں ہندستانی سیکھنے کی زحمت گوارا کریں تو ہم بہت ساری رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اپنی مشترکہ زبان کی منزل کی جانب کامیابی سے قدم بڑھا سکیں گے۔ اصل مقابلہ ہندی اور اردو میں نہیں بلکہ ہندستانی اور انگریزی میں ہے۔ یہ لڑائی بڑی شدید ہے اور میں یقیناً بڑی گہری تشویش کے ساتھ اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔

ہندی اردو تنازعے کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ کانگریس کے تصوّر والی ہندستانی کی شکل ابھی طے نہیں ہو پائی ہے۔ یہ کام اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک کہ کانگریس اپنی تمام تر کارروائیوں میں خصوصی طور پر ہندستانی کا استعمال نہیں کرتی۔ کانگریس کو چاہیے کہ اپنے اراکین کے استعمال کے لیے لغات مہیّا کرے۔ ایک ایسا شعبہ بھی ہونا چاہیے جس کے ذمّے لغت سے باہر کے نئے الفاظ فراہم کرنے کا کام ہو۔ یہ بہت اہم کام ہے۔ یہ کام اس لائق ہے کہ اس پر محنت صرف کی جائے بشرطیکہ ہم حقیقتاً ایک زندہ اور فروغ پذیر ملک گیر زبان کے خواہاں ہیں۔ مجوّزہ شعبہ اس بات کو طے کرے گا کہ موجودہ ادب کے کس حصّے کو ہندستانی تصوّر کیا جائے اور ہندستانی کے تحت کن کتابوں، رسائل، ہفتہ وار اور روزناموں کا احاطہ کیا جائے، خواہ وہ دیوناگری رسم الخط میں ہوں یا اردو رسم الخط میں۔ یہ ایک سنجیدہ کام ہے اور اگر ہمیں اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنی ہے تو سخت محنت کی ضرورت پیش آئے گی۔

ہندستانی کی شکل متعیّن کرتے وقت ہندی اور اردو کو منبع تصوّر کیا جا سکتا ہے جہاں سے اسے خوراک حاصل ہوگی۔ اسی لیے ہر کانگریسی کے لیے یہ ضروری ہوگا کہ وہ دونوں سے گہرا تعلّق رکھے اور جس حد تک ممکن ہو دونوں زبانوں سے رابطہ قائم رکھے۔

اس ہندستانی کے پاس ایسے بہت سے متبادل الفاظ اور محاورے ہوں گے جو صوبائی زبانوں سے مالا مال اس ملک کی متنوّع ضروریات پوری کریں گے۔ بنگال اور جنوبی ہند کے عوام کے سامنے جو ہندستانی بولی جائے گی اس میں قدرتی طور پر سنسکرت اصل کے الفاظ زیادہ ہوں گے۔ لیکن وہی تقریر جب پنجاب میں ہوگی تو اس میں عربی اور فارسی الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوگی۔ یہی صورتِ حال اس وقت بھی پیش آئے گی جب سامعین میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگی جو سنسکرت اصل کے بہت سے الفاظ نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا کل ہند پیمانے کے رہنماؤں کو ہندستانی کے ایسے ذخیرۂ الفاظ پر قدرت حاصل کرنا ہوگی جو انھیں اس کا اہل بنا سکے کہ ہندستان کے ہر خطّے کے سامعین کے سامنے انھیں اپنائیت کا احساس ہو۔ اس ضمن میں پنڈت مالویہ جی کا نام سب سے پہلے ذہن میں آتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ اردو اور ہندی بولنے والے سامعین کے سامنے یکساں روانی کے ساتھ تقریر کر سکتے ہیں۔ میں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ انھیں کسی مناسب لفظ کی تلاش ہے۔ یہی بات بابو بھگوان داس کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو اکثر ایک ہی تقریر میں متبادل الفاظ استعمال کرتے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ تقریر کا وقار مجروح نہ ہونے پائے۔ اس مقالے کو قلمبند کرتے وقت مسلان رہنماؤں میں صرف مولانا محمّد علی کا نام میرے ذہن میں آیا جن کی لفظیات دونوں طرح کے سامعین کے معیار پر پوری اترتی تھی۔ بڑودہ سروس کے لیے مطلوب گجراتی کا علم انھوں نے اچھی طرح حاصل کر لیا تھا۔

کانگریس سے قطع نظر ہندی اور اردو آزادانہ طور پر ترقّی کی منزلیں طے کرتی رہیں گی۔ ہندی زیادہ تر ہندوؤں تک اور اردو مسلمانوں تک محدود رہے گی۔ حقیقتاً اگر تقابل کے ساتھ بات کی جائے تو چند ہی مسلمان اتنی ہندی جانتے ہیں کہ انھیں اسکالر کہا جا سکے۔ اگرچہ میرا خیال ہے کہ ہندی زبان کے علاقوں میں جو مسلمان پیدا ہوتے ہیں وہاں ان کی مادری زبان ہندی ہی ہوتی ہے۔ ہزاروں ہندو ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور سینکڑوں ایسے ہیں جنھیں بجا طور پر اردو کا اسکالر کہا جا سکتا ہے۔ پنڈت موتی لال جی ایسی ہی ایک شخصیت تھے۔ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو اس طرح کی دوسری مثال تھے۔ اس طرح کی مثالیں بڑھتی ہی جائیں گی۔ لہٰذا ان دونوں بہنوں کے درمیان لڑائی جھگڑے یا منفی انداز کی مقابلہ آرائی کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ البتّہ صحت مند قسم کی مقابلہ آرائی ہمیشہ رہنی چاہیے۔

ہر اعتبار سے مجھے یہ اندازہ ہوا ہے کہ مولوی عبد الحق صاحب کی لائق رہنمائی میں عثمانیہ یونیورسٹی اردو کی گراں قدر خدمات انجام دے رہی ہے۔ اس یونیورسٹی کے پاس اردو کی بہت بڑی فرہنگ موجود ہے۔ اردو میں سائنس کے رسالے تیّار کیے جا رہے ہیں اور چوں کہ بڑی ایمانداری سے یونیورسٹی میں اردو کے ذریعے تعلیم دی جا رہی ہے اس لیے اس کا ترقّی کرنا یقینی ہے۔ اگر بے وجہ کے تعصّب کی بنا پر ہندی بولنے والے تمام ہندو اس ادب سے فیض یاب نہیں ہوتے جو وہاں فروغ پا رہا ہے تو یہ قصور انھی کا ہے، لیکن تعصّب کو بہر حال ختم ہونا ہے۔ اس وقت دونوں فرقوں میں جو اختلاف نظر آتا ہے وہ بیماریوں جیسا ہے، محض عارضی! اب اسے اچھا کہیے یا برا دونوں فرقے ہندستان ہی سے جڑے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔ اس زمین کے فرزند ہیں۔ وہ جس طرح یہاں پیدا ہوئے اسی طرح پیوندِ خاک بھی یہیں ہوں گے۔ اگر وہ رضاکارانہ طور پر مل جل کر نہیں رہ سکتے تو قدرت انھیں مجبور کرے گی کہ وہ امن کے ساتھ رہیں۔

مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو صرف اردو زبان یا صرف ہندی کا خواب دیکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ محض ایک خواب ہی ہوگا۔ ایک نامبارک خواب! اسلام کا اپنا مخصوص کلچر ہے اور ہندو مت کا اپنا۔ مستقبل کا ہندستان ان دونوں کی مکمل اور خوشگوار آمیزش کا نمونہ ہوگا۔ جب وہ مبارک دن آئے گا تو مشترکہ زبان ہندستانی ہوگی۔ لیکن اردو اپنے طور پر ترقّی کرے گی جس میں عربی اور فارسی کے الفاظ کو بالادستی حاصل ہوگی۔ اسی طرح ہندی بھی اپنے طور پر ترقّی کرے گہ جس میں سنسکرت الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوگی۔ تلسی داس اور سور داس کی زبان کبھی نہیں مر سکتی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح شبلی کی زبان نہیں مر سکتی۔ لیکن ان دونوں کے بہترین عناصر ہندستانی زبان کے لیے مانوس رہیں گے۔

ایک نامہ نگار کا کہنا ہے کہ اردو کے تئیں میرے رویّے کے تعلّق سے اردو پریس میں میرے خلاف بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ حالاں کہ میں ہمیشہ ہندو مسلم یکجہتی کی بات کرتا ہوں لیکن میرے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ میں ہندوؤں میں سب سے زیادہ فرقہ پرست ذہنیت کا حامل ہوں۔ نامہ نگار نے میرے بارے میں ظاہر کی جانے والی جس رائے کا حوالہ دیا ہے اس کے خلاف میں اپنی مدافعت میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ اس سلسلے میں خود میری زندگی گواہی دے گی کہ ہندو مسلم اتّحاد کے تئیں میرا رویّا کیا رہا ہے۔

لیکن ہندی اردو مسئلہ ’’سدا بہار‘‘ قسم کا ہے۔ اس سوال پر میں نے بارہا اپنے

خیالات کا اظہار کیا ہے پھر بھی انھیں دوہرانے کی ضرورت ہے۔ میں کسی دلیل کے بغیر سیدھے سادے انداز میں اپنے خیال کا اظہار کرتا ہوں۔

میرا یقین ہے کہ:

۱۔ ہندستانی اور اردو ایسے الفاظ ہیں جو شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذریعے بولی جانے والی ایک ہی زبان کی نشاندہی کرتے ہیں جو دیوناگری یا فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

۲۔ اردو نام پڑنے سے پہلے اس زبان کو ہندو اور مسلمان دونوں ہندی کہتے تھے۔

۳۔ بعد میں اسی بولی کے لیے ہندستانی کا لفظ بھی استعمال کیا جانے لگا (اس کا زمانہ مجھے معلوم نہیں)۔

٤۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو یہ زبان بولنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ شمالی ہند کے عوام کی بھاری اکثریت اسے سمجھتی ہے۔

٥۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ بہت سے ہندو اور بہت سے مسلمان بالترتیب سنسکرت الفاظ اور فارسی یا عربی الفاظ کے استعمال پر خصوصی طور پر اصرار کرتے رہیں گے۔ یہ صورتِ حال اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کہ باہمی عدم اعتماد اور علیحدگی پسندی کی فضا قائم رہے گی۔ وہ ہندو جو مسلم فکر کے بارے میں کچھ جاننا چاہتے ہیں وہ فارسی رسم الخط میں اردو کا مطالعہ کریں گے۔ اسی طرح وہ مسلمان جو ہندو فکر کے کسی گوشے کو سمجھنا چاہیں گے وہ دیوناگری رسم الخط میں ہندی کا مطالعہ کریں گے۔

٦۔ بالآخر جب ہمارے دل ایک ہو جائیں گے اور ہم سب اپنے اپنے صوبوں کی بجاے ہندستان پر بطورِ وطن فخر کرنے لگیں گے اور ایک ہی سوتے سے پھوٹنے والے مختلف مذاہب کو سمجھنے اور ماننے لگیں گے جس طرح ہم ایک ہی پیڑ کے متعدّد پھلوں کو سمجھتے ہیں اور ان کے ذائقے سے لطف اندوز ہوتے ہیں، تب ہم ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ رسم الخط کے قریب پہنچ جائیں گے جب کہ صوبائی زبانوں کو ہم صوبائی مقاصد کے لیے برقرا رکھیں گے۔

۷۔ ایک ہی رسم الخط یا ایک قسم کی ہندی یا ایک صوبے یا ضلعے یا ایک علاقے یا فرقے کے عوام کو برتری دینے کی کوشش ملک کے بہرتین مفاد کے لیے ضرر رساں ثابت ہوگی۔

۸۔ رومن رسم الخط ہندستان کا مشترکہ رسم الخط نہ تو ہونا چاہیے اور نہ ہو سکتا ہے۔ مقابلہ صرف فارسی اور دیوناگری رسم الخط کے درمیان ہوسکتا ہے۔ موخر الذکر

(دیوناگری) کی جو اپنی اندرونی خصوصیت ہے اس سے قطع نظر اسی کو کل ہند مشترکہ رسم الخط ہونا چاہیے کیوں کہ بیشتر صوبائی رسوم الخط کا دیوناگری سے اصل تعلّق ہے اور ان کے لیے اسے سیکھنا بہت آسان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ اسے مسلمانوں پر یا ان لوگوں پر جو اسے نہیں جانتے جبراً تھوپنے کی کوشش نہ کی جائے۔

۱۰۔ اردو کو اگر ہندی سے مختلف تصوّر کیا جائے تو میں نے اس وقت اردو کے موقف کی حمایت کی جب اندور میں ہندی ساہتیہ پریشد نے بین صوبائی روابط کو فروغ دینے کے لیے ہندی یا ہندستانی کا نام مشترکہ زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا۔ گویا اس طرح مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کو اس بات کا پورا موقع ملتا ہے کہ وہ ان کوششوں کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑیں جو مشترکہ زبان کو مستحکم بنانے کے لیے کی جا رہی ہیں کہ اسی مشترکہ زبان میں بہترین صوبائی فکر کی ترجمانی بھی ہو سکتی ہے۔

رسم الخط کا سوال:

اب باقی رہا رسم الخط کا سوال۔ موجودہ صورتِ حال میں یہ بات بعید از قیاس ہے کہ مسلمان دیوناگری رسم الخط کے لیے اصرار کریں گے اور یہ سوچنا کہ ہندوؤں کی بڑی تعداد عربی رسم الخط اختیار کرنے پر اصرار کرے گہ بالکل ہی امکان سے باہر ہے۔ اس صورت میں ہندی یا ہندستانی کی تعریف وضع کرنے کے لیے میں‌نے جو تجویز پیش کی وہ یہ ہے کہ ”یہ وہی زبان ہو سکتی ہے جسے شمالی ہند کے ہندو اور مسلمان عام طور پر بولتے ہیں خواہ اسے دیوناگری میں‌لکھا جائے یا اردو رسم الخط میں۔“ اس تجویز کے خلاف جو احتجاج ہو رہا ہے اس کے باوجود میں اسی موقف پر اٹل ہوں۔ لیکن بلا شبہ دیوناگری کے سلسلے میں ایک تحریک چل رہی ہے جس کے ساتھ میں پورے طور پر جڑا ہوا ہوں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا ایک مشترکہ رسم الخط ہو، خاص طور سے ان زبانوں کا جن کے ذخیرۂ الفاظ میں سنسکرت کو بلادستی حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ کوشش اس بات کی کی جارہی ہے کہ تمام ہندستانی زبانوں کے بہترین عناصر کو دیوناگری رسم الخط میں ڈھالا جائے۔

وہ مختلف زبانیں جو سنسکرت سے نکلی ہیں یا اس سے قریبی تعلّق رکھتی ہیں، ان کا ایک رسم الخط ہونا چاہیے اور وہ رسم الخط یقیناً دیوناگری ہی ہوسکتا ہے۔ ایک صوبے کے لوگ اگر دوسرے صوبے کی زبان پڑھنا چاہیں تو مختلف رسم الخط غیر ضروری

رکاوٹ ثابت ہوں گے۔ یہاں تک کہ یورپ نے ایک ہی رسم الخط کو اختیار کیا ہے حالاں کہ وہ ایک قوم بھی نہیں ہیں۔ تو پھر ہندستان ایک رسم الخط کیوں نہیں اختیار کر سکتا جو ایک قوم ہونے کا دعوا کرتا ہے اور ہے بھی ایک قوم۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس اعتبار سے مستقل مزاج نہیں ہوں کہ ایک ہی زبان کے لیے دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط اختیار کرنے کی بات کرتا ہوں لیکن میری یہ ''غیر مستقل مزاجی'' نری بے وقوفی نہیں ہے۔ اس وقت ہندو مسلم ٹکراؤ کا ماحول ہے۔ لہٰذا تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی دانشمندی اور حالات کا تقاضہ ہے کہ ممکنہ حد تک باہمی احترام اور رواداری کو فروغ دیا جائے۔ اسی لیے دیوناگری اور اردو دونوں رسم الخط کی بات کہی جاتی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ صوبوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ اسی لیے اصلاحی اقدامات کی وکالت کی جا رہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک کی بجائے مختلف سطحوں پر صوبوں کے درمیان آپسی روابط استوار کیے جائیں۔ یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ عوام کی بہت بڑی اکثریت ناخواندہ ہے۔ ان پر مختلف رسم الخط کا بوجھ ڈالنا خود کشی کرنے کے مترادف ہوگا اور اس کی وجہ جھوٹی جذباتیت اور غور و فکر سے گریز کرنے کی ذہنیت کے سوا اور کچھ نہیں۔

میں جانتا ہوں کہ آسام کے کچھ قبائل کو دیوناگری رسم الخط کے بجائے رومن رسم الخط کے ذریعے پڑھنا لکھنا سکھایا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں، میں اپنی رائے ظاہر کرچکا ہوں کہ ہندستان میں ایک ہی رسم الخط ہمہ گیر طور پر قابلِ قبول ہوسکتا ہے اور وہ ہے دیوناگری رسم الخط، خواہ وہ موجودہ شکل میں ہو یا اصلاح شدہ شکل میں۔ اردو اور فارسی ساتھ ہی ساتھ رائج رہیں گی جب تک کہ مسلمان خود اپنی مرضی سے خالص سائنسی اور قومی نقطۂ نظر سے دیوناگری کی برتری کو تسلیم نہیں کر لیتے۔ لیکن موجودہ مسئلے کے پیشِ نظر یہ بحث ہی فضول ہے۔ ان دو رسم الخط کے ساتھ رومن رسم الخط کو بہر حال رائج نہیں کیا جا سکتا۔ رومن رسم الخط کے جوشیلے حامی ان دونوں کو بے دخل کردیں گے۔ سائنسی حقیقت اور جذبات، یہ دونوں چیزیں رومن رسم الخط کے خلاف ہیں۔ اس کی ایک چیز قابلِ ذکر ضرور ہے۔ یعنی چھپائی اور ٹائپ میں آسانی رہتی ہے لیکن اس بات کو اگر ذہن میں رکھا جائے کہ اسے سکھانا لاکھوں افراد پر جبر کرنے کے مترادف ہوگا تو اس کے مقابلے میں ان آسانیوں کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔ وہ لاکھوں کروڑوں افراد جو اپنا ادب اپنے صوبائی رسم الخط یا دیوناگری میں پڑھنا چاہتے ہیں ان

کے لیے رومن رسم الخط قطعی معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ دیوناگری سیکھنا لاکھوں ہندوؤں بلکہ مسلمانوں کے لیے بھی آسان ہے کیوں کہ بیشتر صوبائی رسم الخط دیوناگری ہی سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اس میں مسلمانوں کو میں نے قصداً شامل کیا ہے۔ بنگالی مسلمانوں کی مادری زبان بنگلہ ہے جس طرح تمل مسلمانوں کی تمل ہے۔ اردو کو رائج کرنے کی موجودہ مہم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پورے ہندستان کے مسلمانوں کو اپنی مادری زبان کے علاوہ اردو کو ایک اضافی زبان کے طور پر پڑھنا پڑے گا۔ جب کہ قرآن شریف پڑھنے کے مقصد سے عربی انھیں یوں بھی سیکھنا پڑتی ہے لیکن لاکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کو رومن رسم الخط سیکھنے کی کبھی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہ ضرورت صرف اسی وقت پیش آئے گی جب وہ انگریزی سیکھنا چاہیں گے۔ اسی طرح ہندو جب اپنے مذہبی گرنتھ کا اصل شکل میں مطالعہ کرنا چاہیں گے تو انھیں دیوناگری رسم الخط سیکھنا ہی پڑے گا۔ گویا دیوناگری رسم الخط کو ہمہ گیر بنانے کی مہم کے پیچھے ایک مضبوط بنیاد ہے۔ رومن رسم الخط رائج کرنا ایک غیر ضروری بوجھ لادنے کے مترادف ہے جو کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ جبری بوجھ اس وقت خس و خاشاک کی طرح اڑ جائے گا جب عوامی بیداری پیدا ہوگی، اور یہ بیداری آ رہی ہے۔ یہ بیداری اس سے بھی جلدی آئے گی جتنی جلدی ہم میں سے کچھ لوگ بعض وجوہ سے امید کرتے ہیں۔ پھر بھی کروڑوں عوام کو بیدار ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اسے ڈھالا نہیں جا سکتا۔ یہ پراسرا طور پر آتی ہے یا آتی ہوئی نظر آتی ہے۔ قومی کارکن تو عوام کی نبض پہچان کر اس عمل میں محض تیزی لانے کا باعث بن سکتے ہیں۔

مترجم: معین اعجاز

_ بشکریہ، ''اردو دنیا'' (نئی دہلی)،
جلد ۲، شمارہ ۱۰ (اکتوبر ۲۰۰۰)، صفحہ ۱۷ تا ۲۱